My soul is among lions and I lie even among them that are set on fire, even the sons of men, whose teeth are spears and arrows, and their tongue a sharp sword. They have prepared a net for my steps; Psalm 57:4, 6

Dear brother & sister in Christ,

We greet you in the Name of our redeemer Lord Jesus Christ.

The religion situation in Pakistan is known to the world. It is the dire need of the day to provide religion plus academic education to all and specially the young generation to face the future challenges. We are in possession of very old literature written by the Christian scholars in Urdu, but request to say that we have no source to get this literature reprinted or make its photo copies of the same at this moment. It is high vision to spread this valuable literature among our community. For the fulfillment of this divine vision, your cooperation is needed urgently. We need to build a library, E library and a Manuel library to protect this literature.

We need your help, technically and financially to buy one photo copy machine to do so…. Please join hands if you have such literature like old religious books, magazines, Bible in different langue please donate us. You're Pray. Technical and financial support will make this impossible target possible.

Remember us in your Prayer. May God Pour out his abundant Mercies upon you all.

Yours in Christ.

Rev. Micheal Joseph.
Crsc.korea@gmail.com

The Social Applicability of the Gospel Ethics

BY

FREDERICK A. M. SPENCER, B. D.

انجیلی اخلاق کا معاشرتی اطلاق

مصنفہ

پادری فریڈرک اے۔ ایم۔ سپنسر صاحب بی۔ڈی

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی

انار کلی۔ لاہور

۱۹۳۲ء

بار اول

تعداد ۲۰۰۰

P. R. B. S., LAHORE

انجیلی اخلاق کا معاشرتی اطلاق

قبل ازیں کہ ہم خداوند یسوع مسیح کے نام پر معاشرتی اصلاح کا آغاز کریں۔ یہ بہتر ہوگا کہ ہم پہلے ان چند شبہات پر غور نظر کریں جو اس امر کے متعلق رائج ہیں کہ آیا مسیح کی تعلیم کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں۔ یہ اعتراض پیش کیا جاچکا ہے کہ اپنے اخلاقی اصولوں سے خداوند مسیح کا مدعا محض یہ تھا کہ بنی نوع انسان کو اُس قلیل عرصہ میں جو دنیا کے اختتام سے پیشتر باقی تھا تیار کرے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ خداوند مسیح کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کو ایک فانی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی تعلیم دیں نہ یہ کہ وہ ایک ترقی کنان دنیا کی اصلاح کریں۔ یہ نظریہ ڈاکٹر جوہنیس ویس (Dr. Johannes Weiss.) کا پیش کردہ ہے جو عموماً "نظریہ مستعمک" (عارضی) کے نام سے مشہور ہے اور اس کی تشریح (Die Predigt Jesu Vom Reiche Gottes.) میں کی گئی ہے۔ یہ دو اصولی اسباب پر مبنی ہے اول یہ کہ بیان کیا گیا ہے کہ خداوند مسیح نے کئی بار پیشینگوئی کی کہ دنیا کا اختتام اور خدا کی بادشاہت کا قائم ہونا اس کے ہمعصروں کی عین حیات میں ہی

وقوع میں آئیگا۔ دوم یہ کہ اُس کی تعلیم جیسا کہ ظاہر ہے ایک مہذب جماعت کی معمولی زندگی کے مناسب حال نہیں۔

ڈاکٹر ویس کو مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خداوند مسیح کی زندگی میں بھی ضرور چند لمحے ایسے آتے ہونگے جو خوش طبعی و تفریح کے ہوتے ہونگے۔ "وہ جنگلی سوسن اُسے اپنی خوبصورتی اور نزاکت کی زبان حال سے اپنے خالق کے محافظ ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ ایک طفل کم سن کی نگاہوں میں اُسے خدا کی ہستی کے نور کی اشعہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ جواُن چھوٹے بچوں کو پیار کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے ہی موقعوں پر اس کے مبارک دہان سے وہ اقوال صادر ہوئے جو سراسر پاکیزگی اور فہم و فراست سے لبریز ہیں وہ الٰہی تحریک کو ظاہر کرنے کے بجائے محض اُن حقائق کا اظہار کرتے ہیں جو اُس کی پاک منور اور خدا سے تائید یافتہ روح نے صریحاً مشاہدہ کئے تھے۔ وہ نوکیلی اور تکلیف دہ میخوں کا سا اثر نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمیشہ تسکین و راحت بخش اور خوبصورت نظر آکر ہر ایک زمانہ میں انسانیت و بشریت کو اپنی غیر فانی مستقیم طاقت سے استحکام و استواری بخشتے ہیں۔" ڈاکٹر ویس کا یہ خیال تھا کہ یہ خوش مزاجی کی حالت ضرور اُس مزاج سے تبدیل ہوگئی ہوگی جو دنیا کی بربادی کے اندیشے کا نتیجہ تھا اور جس کے رنگ میں اُس کی تمام تعلیم رنگی ہوئی ہے" اُس کے مطالبے ایک کامل انسانی جماعت کے معیاری تصور سے ماخوذ نہیں نہ ہی وہ عام اخلاقی معیاروں سے انتخاب کئے گئے ہیں۔ بلکہ وہ دورِ حاضرہ کی دہشت انگیز سنجیدگی پر مبنی ہیں۔ دنیا کی تاریخ کا سب سے زیادہ نازک وقت سر پر موجود ہے۔ مبارک ترین نجات اور خوفناک ترین بربادی دونو قریب الوقوع مستقبل کی ظلمت میں نہاں ہیں۔ اب پھر آخری مرتبہ ہر ایک فرد بشر کو موقع بخشا جاتا

ہے کہ وہ اپنی دائمی تقدیر و قسمت کے متعلق فیصلہ کرے۔ وقت فرصت قلیل ہے اور مشاغل کثیر ہیں لہٰذا انسب یہی ہے کہ جلد رضائے الٰہی کو دریافت کریں اور اُس کی خوشنودی کو حاصل کرنے کے لئے حتی المقدور کوشش کریں۔ اکثر ویس اس مغالطہ کو یوحنا اصطباغی کے اثر سے منسوب کرتے ہیں۔ اگر یردن کی پکار اُسے مسیحائی تحریک کی جانب کھینچ کر نہ لے جاتی تو ممکن تھا کہ شاید وہ اپنی خوش طبعی اور سلیم العقلی کی وجہ سے جو اُس کی قدرتی و طبعی خصائل تھیں۔ ایک بشارتی علم اخلاق کا بانی ٹھہرتا اور غالباً وہ علم اخلاق ایک نہایت سنجیدہ علم ہوتا۔ لیکن تو بھی وہ اس دنیا میں مسرت بخش اور خوش کن ضرور ہوتا۔ لیکن حقیقت میں اس کی رُوح چند آرام کے لمحوں کو چھوڑ کر باقی تمام وقت ایک اور سُر الاپتی تھی اور اسی طور سے وہ ہمارے خداوند کے احکام کی تشریح کرتا تھا مثلاً اپنے دشمنوں سے محبت کرنے کے بارے میں خداوند کا فرمان پھر اس کا دولتمند سردار کو اپنے مال کے فروخت کر دینے کی ہدایت دینا۔ پھر اُس کا ظاہری طور پر ایک متلاشی کو اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کے لئے اجازت دینے سے انکار کرنا اور شاگردی کی عجیب و دہشت ناک شرائط کا پیش کرنا یعنی ماں، باپ، بھائی اور بہن سے دشمنی کرنا۔ یوحنا اس قسم کے تمام احکام کے مطالب کو لوگوں کے ذہنوں پر واضح کرتا تھا۔

خداوند یسوع مسیح کے خیالات اور اس کے پیغام کی اس پُر زور اور کسی قدر غیر ہمدردانہ و ناموافق تشریح میں سے صدق و خطا کے اُلجھے ہوئے رشتوں کا سلجھانا کوئی آسان کام نہیں۔ ہمارے مضمون کی وضاحت کے لئے ذیل کی چند تنقیدیں کافی ہونگی۔

۱۔ ہم سب سے پیشتر انٹر مستھک کے اصولی مفروضہ پر اعتراض پیش کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ خداوند مسیح دنیا کے قریبی اختتام کا انتظار اپنے طریقہ

سے کرتا تھا جس سے اس کی اخلاقی تعلیم کا ایک بھاری جز ہونا قابل عمل ٹھہرتا ہے۔ یہ امر بخوبی ظاہر ہے کہ کشفی الہامی عنصر مقدس متی کی انجیل میں بمقابلہ مقدس مرقس اور مقدس لوقا کی اناجیل کے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً بجائے اس عبارت کے "جب تک وہ خدا کی بادشاہت کو زور سے آتے نہ دیکھینگے" (مرقس ۹:۱) اور "جب تک کہ وہ خدا کی بادشاہت کو نہ دیکھینگے" (لوقا ۹:۲۷) متی یوں رقمطراز ہے "جب تک وہ ابن آدم کو اپنی بادشاہت میں نہ دیکھینگے" (متی ۱۶:۲۸) چونکہ متی کا طرزِ کلام گذشتہ دو صدیوں کے یہودی الہامی صحائف کی یادگار ہے اس لئے ہمیں پوری آزادی ہے کہ اُن بیانات کے متعلق جو انجیل میں دنیا کی آخرت اور روز عدالت کی بابت درج ہیں اگر چاہیں تو اپنے دلوں میں شک کو جگہ دیں کہ آیا وہ بعینہ مسیح کے قول و فکر کی صحیح آئینہ داری کرتے ہیں یا نہیں۔

۲۔ لیکن اگر ہم اجمالی اناجیل کے تمام بیانات کا جیسے وہ مرقوم ہیں مطالعہ کریں تو بھی ہم کہیں یہ واضح طور سے لکھا نہیں پاتے کہ مستقبل قریب میں قیامت کُلیہ اور عدالت خدا کی بادشاہت کے آنے پر وقوع میں آئیگی۔ بلکہ اس خیال کی گنجائش ہے کہ کلام میں ایسے اشارات موجود ہیں جن سے یہ آشکارا ہوتا ہے کہ گو مسیح ہمیشہ نہیں تو بھی گاہے گاہے ضرور یہ خیال کرتا تھا کہ اس کرۂ ارض کے تمام فانی کیفیات کا خاتمہ ایک مدت مدید کے گذرنے سے پیشتر ممکن نہیں۔ مثلاً یہ الفاظ کہ "انجیل کی یہ خوشخبری تمام جہان میں سنائی جائیگی۔ تاکہ سب قوموں کے لئے گواہی ہو۔ پھر آخرت ہوگی" اس امر پر دلالت کرتے ہیں۔ نکاح کے متعلق اُس کی تعلیم میں ہم کہیں کوئی اشارہ اس بات کی طرف نہیں پاتے کہ کچھ عرصہ کے بعد

نکاح منسوخ ہوجائیگا۔

۳۔ ہمارے خداوند کی تعلیم کے بنیادی اصول ازلی ہیں۔ خدا اور انسان سے محبت رکھنے کے اصول ہر دو جہان میں جائز ہیں یعنی وفا۔ صداقت اور مشقت کے احکام بھی ایسے ہی ہیں۔ ہم اسی دنیا میں جو کروڑہا سال تک قائم ہے ان نیک خصائل کی مشق کر سکتے ہیں جن کی ضرورت آنے والی دنیا میں ہوگی جو ابد تک قائم رہیگی۔ گو ایسا کرنا تکلیف دہی سے خالی نہیں تو بھی آخرکار اس کے ذریعہ ہی ہم آنے والی دنیا میں داخل ہونے اور اس میں زندگی بسر کرنے کے قابل یا نااہل ٹھہرتے ہیں وہ محاسن جن میں دکھ اور گناہ کے عناصر شامل ہیں یعنی رحم و عفو و شجاعت ان کے لئے دائرہ عمل کم ہوگا اگرچہ یہ بھی قیاسی طور سے ان لوگوں کو اندر بلانے کے لئے استعمال کی جا سکتی ہیں جو بادشاہت کے باہر کھڑے ہیں۔ اس لئے اگر ہم یہ فرض کر بھی لیں کہ ہمارے خداوند کو یہ امید تھی کہ اس کے کلام کرنے کے کچھ عرصہ بعد یہ دنیا بالکل برباد کر دی جائیگی اور انسانی نسل کے قائم رکھنے کے لئے ایک نیا کرہ خلق کیا جائیگا۔ اور اس کے نوزاد افراد اسی وقت غیر فانی بنائے جائینگے تو بھی اس عجیب و غریب مفروضہ کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے اپنی اخلاقی تعلیم کی دائمی صحت کا یقین تھا۔

۴۔ ڈاکٹر ویس ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ دشمنوں کا مقابلہ نہ کرنے کے متعلق جو احکام ہیں وہ ان کی اصلاح کرنے اور انہیں شرمندہ کرنے سے مطلق کوئی واسطہ یا تعلق نہیں رکھتے بلکہ تمام زور اس امر پر دیا گیا ہے کہ ظلم برداشت کرنے کے لئے مستعد رہو" کیونکہ یہ دنیا سے تعلق

قطع کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اسی ضمن میں ہمیں ایک اور مقام پر غور کرنا چاہئے جہاں خداوند مسیح انتہائی درجے کی خیرات اور فیاضی کی ترغیب دیتا ہے "خلاصی دو تم بھی خلاصی پاؤگے۔ دیا کرو تمہیں بھی دیا جائیگا۔ اچھا پیمانہ داب داب کر اور ہلا ہلا کر اور لبریز کر کے تمہارے پلے ڈالینگے کیونکہ جس پیمانہ سے تم ناپتے ہو اسی سے تمہارے لئے ناپا جائیگا" اس میں یہ خیال مدِ نظر رکھا گیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنے سے ہم انہیں اپنے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے پر راغب کرینگے۔ پھر پہاڑی وعظ میں آیا ہے "اسی طرح تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی کریں"۔ یہاں دوسرے لوگوں کو خداوند کے لئے جیت لینے کا مقصد صاف عیاں ہے۔ اپنے دشمنوں کو حلم و فروتنی کے باعث فائدہ پہنچانے کے خیال کو چھوڑ کر "مقابلہ نہ کرنا" زیادہ قابل تحسین ہے کیونکہ اس طرح جھگڑے و فساد سے احتراز کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ خداوند کے چند ایک اور اقوال ہیں جنہیں ڈاکٹر ویس مشکل تصور کرتے ہیں اور ترک دنیا سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ در حقیقت شاگردی کی شرائط کے صاف اور صریح بیانات ہیں۔ لیکن وہ باقی دنیا پر عائد نہیں ہوتے مثلاً مندرجہ ذیل کے کلمات یعنی "اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ

آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا . . . . . . پس اسی طرح تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا" اور اسی طرح وہ ظاہرا سخت اور تلخ جوابات جو اس شخص کو دئے گئے جس نے اپنے باپ کو دفن کرنے کے لئے رخصت مانگی تھی اور اُس شخص کو جس نے اپنے رشتہ داروں کو الوداع کہنے کی مہلت مانگی تھی دئے گئے۔ یہ درحقیقت ایسے اشخاص کو دئے گئے جو اُس کے شاگرد بننے کی آرزو رکھتے تھے۔ مال فروخت کرنے کی ہدایت کے ساتھ ہی جو اُس دولت مند سردار کو دی گئی یہ دعوت تھی "آ اور میری پیروی کر" مسیح خداوند کے بشیروں کی جماعت میں شریک ہونے کا مطلب اہل و عیال سے تعلق قطع کرنا اور ہر طرح کی مصائب اور تکالیف کے لئے تیار رہنا تھا۔ مسیح خداوند نے تمام اہالیان ملک کنعان کو ان معانی میں اپنے شاگرد بننے کا حکم نہ دیا تھا اور نہ اُس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کو بالکل ترک کر دیا جائے۔

پس یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خداوند کے خیال میں خدا کی بادشاہت کے شرکاء محض وہ لوگ ہونگے جنہوں نے انجیل کی بشارت کی خاطر خاندانی تعلقات اور دنیوی امور سے قطع تعلق کیا ہو۔

۶۔ ڈاکٹر ویس اس امر پر اظہار تأسف کرتے ہیں کہ مسیح کی تعلیم میں ایسے اقوال موجود نہیں جو کار ہائے ملکی کی تعریف و تحسین یا ان کی انجام دہی کی طرف توجہ دلانے کے لئے کہے گئے ہوں یا جو ایسے کاموں کو خدا کی خدمت کے نام سے تعبیر کرتے ہوں۔ بعضوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ خداوند مسیح نے غلامی کے رسم و رواج کی تردید نہیں

کی۔ ہماری دانست میں شاید اُسے یہ بات ناپسند ہو کہ اُس کے پیرو ملکی تنازعات و معرکوں میں حصہ لیں۔ بہرحال اُسے بخوبی معلوم تھا کہ وہ طبقہ جس میں وہ بود و باش کرتا تھا بربادی کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ لہذا ممکن ہے کہ اُس نے خیال کیا ہو کہ اس کی اصلاح کرنا محض تضیع اوقات ثابت ہو۔

۷۔ غالباً خداوند مسیح کو اپنی زندگی کے مدارج میں کسی وقت یہ توقع ہو کہ اُس کی رسالت کا نتیجہ ایک نئی مخلوق ہو گا۔ اُس کے ناصرۃ کے وعظ سے اس امر کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہاں اُس نے نبی کے مندرجہ ذیل الفاظ پڑھے "خداوند کی روح مجھ پر ہے۔ اس لئے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کے لئے مسح کیا۔ اُس نے مجھے بھیجا کہ قیدیوں کو رہائی اور اندھوں کو بینائی پانے کی خبر سناؤں کچلے ہوؤں کو آزاد کروں۔ اور خداوند کے سال مقبول کی منادی کروں۔" اس کلام کے پڑھنے کے بعد ہی اُس نے فوراً یوں فرمایا "آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا" گویا ان الفاظ سے اُس کی مراد یہ تھی کہ نبی نے پیشینگوئی کی تھی کہ ایک شخص آکر مرفہ اور آسودہ حالی کی خبر سنائیگا۔ وہ شخص میں ہی ہوں اور وہ زمانہ بھی عنقریب آنے والا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعہ خداوند مسیح نے اپنے آپ کو انبیائے سابق و بزرگ کے زمرہ میں شمار کر لیا۔ جنہوں نے پہلے رسمی معاشرتی گناہ کی تنبیہہ و تادیب کی تھی۔ اور اُس کے بعد ایک نیک و صالح زمانہ کی پیشینگوئی کی تھی۔ پروفیسر روشنبش (Prof. W. Rauschenbusch.) یوں

رقم طراز ہیں ہ۔ کسی شخص کا کسی پہلو اور نقطہ خیال پر زور دینا (اہل یہود کی امید کے موافق) ہمیشہ قومی اور اجتماعی رائے تصور کیا جاتا تھا۔

یہ اہل یہود کا بحیثیت قوم دوبارہ ظاہری آزادی۔ امن و امان و اختیار حاصل کرنے پر دلالت کرتا تھا۔ جیسا کہ شاہان خاندان داؤد کے زمانہ میں انہیں میسر تھا۔ اُس میں وہ معاشرتی عدل۔ خوشحالی اور شادمانی پوشیدہ تھی جس کی ترغیب شریعت اور انبیاء نے دی اور جس کی تمنا ہمیشہ عوام الناس کو دامنگیر تھی۔ اس میں وہ مذہبی پاکیزگی و تقدس تھی جس میں قوم یہود ہمیشہ قاصر رہی تھی اور یہ سب ایک ایسے عمدہ و شاندار طریق سے ظاہر ہونے کو تھیں جو خدا کی حکمت کے بغیر ناممکن تھا۔ جس وقت خداوند مسیح نے یہ الفاظ یعنی ”خدا کی بادشاہت“ اپنی زبانِ مبارک سے نکالے ہونگے تو سامعین کے ذہن میں فوراً وہ موضوع آگیا ہوگا اور اگر مسیح کا مدعا اور مفہوم بعینہٖ وہ نہ تھا جو الفاظ مذکورہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے تو ان الفاظ کا استعمال بے موقع اور بے محل تھا۔

لیکن اس میں اور خداوند مسیح کی تعلیم میں جو یقیناً روحانی تھی مطابقت اور موافقت کیونکر ممکن ہوسکتی ہے خاص کر اُس کے آخری ایام کی تعلیم۔ معلوم ہوتا ہے کہ برگزیدہ قوم سے ردّ کئے جانے کے تجربہ کے بعد خدا کی بادشاہت کے معاشرتی پہلو کی نسبت اس کے خیال میں کسی قدر تبدیلی ضرور واقع ہوئی ہوگی۔ کیونکہ جن الفاظ میں وہ یروشلم کی عداوت اور سرد مہری کا بیان کرتا ہے۔ اُن کے کہے جانے کی وجہ بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ خداوند

مسیح کو پہلے ہی سے یقین کامل ہوگا کہ اُن کی حالت اس کے سوا کچھ اور ہوگی۔ اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اُسے اپنی موت کا یقین اس وقت ہُوا ہوگا جب اُسے بخوبی معلوم ہوگیا ہوگا۔ کہ اہل یہود اُسے قومی طور پر قبول کرنے کو ہرگز تیار نہیں۔ لیکن اس فیصلے کہ وہ اپنی رسالت کے مقصد کو یعنی خدا کی بادشاہت کو فقط اپنی موت کے ذریعہ اور اُس کے بعد ہی قائم کرسکتا تھا۔ خود بخود یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے سوشل اصلاح کے لائحہ عمل کو ضرور ملتوی کیا ہوگا۔ اس سے بڑھ کر اس کی موت کی انتظاری میں ایک ظفرمندانہ آمد کی امید کا راز پنہاں تھا اگر مسیح کو استثنا اور یسعیاہ کے صحیفوں کا ”مصیبت زدہ خادم“ بننا تھا تو ساتھ ہی اس کو کسی نہ کسی معنی میں حنوق کی کتاب کا فوق الفطرت ”ابن آدم“ بھی بننا تھا۔

اس الہامی نقطۂ نگاہ کو تسلیم کرنے سے انبیاء کا نقطہ خیال باطل نہیں ٹھہرتا اگرچہ اُسے یہ معلوم تھا کہ وہ دوبارہ جلال کے ساتھ آئیگا تو بھی اُس پر یہ بھی ضرور واضح ہوگا کہ اُسے نسل انسانی کی اصلاح ان کی فانی حالت ہی میں کرنی ہے اس سے پیشتر کہ وہ انہیں بقا کی حالت میں اٹھا کر اوپر آسمان پر لے جائے۔ بہرحال اگر ہم اپنے خداوند کے جلد واپس آنے کی پیشینگوئی کو اُس کی روحانی معاودت اور کلیسیا کے ہمیشہ اُس کے زیر اثر رہنے کی طرف اشارہ سمجھیں تو دراصل حقیقت یہی ہے جو واقع ہوئی اور ہنوز ہو رہی ہے۔ لیکن یہ محض اس صورت میں جب کہ ہمیں اس

امر کا یقین کامل ہو کہ دورِ حاضرہ میں بھی خداوند مسیح اپنے اُن بندوں کو جو اُس پر ایمان لاتے ہیں ذاتی طور پر تحریک دیتا ہے۔ اُس نے یقیناً اپنی تعلیم کے ذریعہ اور راہِ راست اور بلا توسط بھی اگر مسیحی مذہب کا اعتقاد و ایمان درست ہے اپنے بندوں کو اُس اعلےٰ نمونہ تک پہنچادیا ہے جو اُس نے ناصرۃ میں اپنے سامعین کے پیش نظر رکھا تھا۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ طریقہ اس طریقہ کی نسبت جس کا اندازہ خداوند مسیح نے اپنے محدود دنیوی علم سے لگایا ہوگا بہت ہی آہستہ آہستہ ترقی کی جانب بڑھ رہا ہے تو بھی اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ درحقیقت اُسی کی تجاویز کی تکمیل ہے جو اُس نے انسان کے متعلق خدا کے مقصد کو ظاہر کرنے میں استعمال کیں۔ یہ ضرور نہیں کہ اس خیال سے آئندہ زندگی کی نسبت جو اس کی پیشینگوئیاں ہیں اُن کے پورا ہونے کے متعلق کسی لائق یا مناسب امید کی تردید ہو۔ یعنی زمانہ کے اختتام پر اس کی حضوری کا صاف و صریح اظہار۔ اگر ہم خداوند مسیح کی تعلیم کے متعدد پہلوؤں کو باہم ملانا چاہیں تو ہمیں ایک ایسی معاشرتی ترقی تصور کرنی ہوگی جو کسی قدر باترتیب و سلسلہ وار تو ہوگی لیکن اُس کی راہ میں گاہے گاہے آزمائشوں، غضب الٰہی اور سے نئے انتقالوں کی علامات بھی ضرور نظر آئینگی اور جو ایک ایسی روحانی زندگی کی جانب ترقی کریگی جس کے ذریعہ آخرکار خدا اور انسان میں باہم یگانگی پیدا ہوگی اور موت زندگی کا لقمہ بن جائیگی اور بنی نوع انسان خداوند مسیح کے قول کے موجب فلک پر ملائکہ کے ہم شکل بن جائینگے۔

خیر یہ خواہ کیسے بھی ہو لیکن زمین پر خداوند مسیح کی تعلیم اور پھر اس کے بعد اُس کے بندوں میں جو اُس پر ایمان لاتے ہیں جوش و غیرت کے آثار نمایاں ہونے سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ انسانی جماعت کو مسیح کی تعلیم کے اصولوں کے ذریعہ بدلنا اور ان کی حالت کو سُدھارنا مسیحی مذہب کے استعمال کرنے کا ایک زبردست وسیلہ ہے۔

(۲)

حالانکہ ہم انٹرمیستھک (Interimsethic.) نظریہ کو اس کی موجودہ صورت میں قبول نہیں کرسکتے تو بھی ہم اس حقیقت سے گریز نہیں کرسکتے کہ چونکہ اخلاقی امور کے متعلق مسیح کی تعلیم اُس کے اپنے زمانہ کی حالت کے لئے نہایت موزوں تھی۔ اس لئے وہ ایک ایسی صورت رکھتی ہے جو باقی زمانوں کے مناسب حال نہیں ٹھہر سکتی۔ وہ ایک محدود و عارضی زمانہ کے اخلاق کے متعلق تھی اور چونکہ ایک نظریہ ارتقائے انسانی دوسرے نظریہ سے کامل مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے ممکن نہیں کہ وہ تعلیم جو ایک کے مناسب حال ہو وہ بغیر کسی تبدیلی و ردوبدل کے بعینہٖ دوسرے کے حالات کے مطابق ہو۔ مسیح کے زمانہ کے لوگوں میں چند خصوصیات ایسی تھیں جن کی وجہ سے اُس نے اُن اخلاقی اصولوں کو ایک خاص طریقہ سے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور وہ مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) اُس زمانہ کے لوگ سادہ طبیعت رکھتے تھے اور نقل و حرکت کے طریقے بہت مشکل تھے۔

(۲) لوگ مسیحی مذہب کے متعلق نہایت بے پروا تھے۔ بلکہ بعض اوقات اُس سے متنفر بھی تھے۔

(۳) اس نئے مذہب کا آغاز ایک ایسی قوم میں ہوُا جو اپنی قومی حُرّیت کو کھو چکی تھی۔ اور ایک ایسی قوم سے محکوم تھی جس کو اس مذہب سے مطلق کوئی ہمدردی نہ تھی۔ بلکہ وہ اُس کے عقل و فہم سے بالاتر تھا۔

(۴) حقیقت میں دنیا کا آخر قریب تھا لیکن اُن معانی میں نہیں جیسا کہ یہودی مصنفوں کا خیال ہے۔

مذکورہ بالا حقیقتوں کے معائنہ کرنے سے ہم اپنے خداوند کی اخلاقی تعلیم کی اُن اثباتی و انکاری خصوصیات کو کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں جو موجودہ حالت کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوتیں:۔

(۱) لوگوں کی باہم یگانگی کی عدم موجودگی اور ان کے زیادہ تر ایک ہی جگہ مقیم رہنے نے اُن کے اخلاق اور جماعت کی استواری اور استقلال کے حق میں، بلا تمیز خیرات کرنیکے مضر اثرات کو کم کر رکھا تھا۔ کاہلی اور فریب کاری ضبط کی جا سکتی تھیں اور ملک میں سیاسی بدامنی کے جلد پھیل جانے کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ اس لئے ہمارے خداوند کی تعلیم میں زکوٰۃ و خیرات کے متعلق کوئی احکام مذکور نہیں۔

(۲) مسیح کے نام میں جو کارہائے عظیم و شایان کیئے جاتے تھے اُن سے ہمیشہ عملی مخالفت کے برپا ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لئے ان میں اور خاندانی تعلقات اور اعلیٰ مراتب میں کسی قسم کی موافقت و مطابقت ممکن نہ تھی۔ پس شاگردوں کو فرمان دیا جاتا ہے کہ سب کچھ

ترک کر کے اپنے اعزا و اقربا سے اظہار تنفر کریں۔

(۳) چونکہ اُس وقت دنیا کی اصلاح کی کوئی فوری امید نہ تھی اس لئے ہمارے خداوند نے ملکی انتظامات کی طرف رجوع نہ کیا۔ بلکہ فرمایا "جو چیزیں قیصر کی ہیں قیصر کو دو"۔

(۴) حکام و محکوم کے باہمی تنازعے یعنی ایک طرف تو رومیوں کا اپنی رعایا کو بنظر حقارت دیکھنا اور ان پر جور و جفا کو روا رکھنا تھا اور دوسری جانب اہل یہود کا اپنے افتخار قومی کو برقرار رکھنا یہ دو نوا ایسے معاملات تھے جو یقیناً فساد و جھگڑے کی جڑ تھے۔ یہ صاف عیاں تھا کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو فتح ضرور رومیوں کو حاصل ہوگی۔ پس ایسی حالت میں معاشرتی اصلاح بالکل بے سود ثابت ہوتی۔ رومی تہذیب میں تنزل و انحطاط کے آثار نمایاں ہو رہے تھے جن سے خوب روشن تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ خود بخود کسی ایسی قوم کے ہاتھوں برباد کئے جائینگے جو اخلاقی طور پر ان سے بدرجہا بہتر ہوگی۔ ہنوز وہ زمانہ نہ آیا تھا کہ طفلانِ شیر خوار کی زندگیوں کے بچانے کی فکر کی جائے۔ یا بڑھتی ہوئی نسل کے لئے حفظانِ صحت کے قواعد بنائے جائیں اور اس کے لئے مناسب خوراک کا بندوبست کیا جائے۔ یا جسم انسانی کی نشو و نما کا کوئی خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ ان تمام امور کی طرف لوگوں کی توجہ ابھی راغب نہ ہوئی تھی جن کے انجام دینے میں اب غیرت مند مسیحی نہایت سرگرمی سے مشغول ہیں۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے خداوند کی تعلیم میں ایسی ناقابلِ تسلیم خصوصیات موجود ہیں جن میں اثبات اور نفی دونو کے عناصر

پائے جاتے ہیں خصوصاً نفی کے۔ اثبات کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے خیال کے مطابق ہر ایک سائل کو جو کچھ وہ مانگے دے دینا درست نہیں اور نہ ہی ہم اپنی عقل کی رو سے لفظی معانی میں جائداد کو ترک کرنے۔ کام سے دست بردار ہونے اور متعلقین سے رشتۂ تعلق کو منقطع کر دینے کو واجب و جائز قرار دیتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض اشخاص جن کو خدا کی طرف سے خاص بلاہٹ آئی ہو اور وہ کفر و الحاد کے تاریک بادلوں سے گھرے ہوں تو انہیں ان تمام اشیا سے کنارہ کشی اختیار کرنا درست ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جہاں مسیحی مذہب کا اقرار کیا جاتا ہو۔ خواہ وہ کتنی ہی بے اعتنائی سے کیوں نہ ہو۔ وہاں آسمان کی بادشاہت کی خدمت کرنی زیادہ آسان ہے بہ نسبت اُس دنیا کے جہاں ہمارا خداوند بودو باش کرتا تھا۔

اب ذرا نفی کی جانب نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر ویس کے قول کے موافق ہم اناجیل اربعہ میں کہیں نہیں دیکھتے کہ عوام الناس کی خدمت کرنے کو خدا کی خدمت کے نام سے نامزد کیا گیا ہو اور اُس کی تعریف و تحسین کی گئی ہو۔ بنی نوع انسان کی باقاعدہ اور متواتر خدمت سے متعلق کوئی فرمان نہیں پایا جاتا جس کے وسیلہ کوئی بہتر نسل قائم کی جائے جو جسمانی و روحانی ترقی کی جانب مائل ہو اور جو باہمی محبت اور مشترکہ خیالات کے مضبوط رشتوں سے وابستہ ہو۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یروشلم میں ناصری فرقہ نے جماعت قائم کرنے اور اس کی آئین بندی کی بہت کوشش

کی لیکن مخالفین کی ایذا رسانی کے سبب سے اُس کو مستحکم کرنا ممکن نہ ہُوا۔

خداوند مسیح کی اخلاقی تعلیم محض ظاہری صورت میں موجودہ زمانہ کے مطابق نظر نہیں آتی لیکن یہ حقیقت نہیں۔ آج کل بھی حلم و فروتنی کے ذریعہ سے دوسروں کو گرویدہ کر لینا ممکن ہے۔ ہمیں اب بھی یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ کشادہ دلی سے خیرات کریں۔ البتہ خیرات کرتے وقت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اب بھی ہمارے کانوں میں یہ صدا آتی ہے کہ جان و مال کے لئے بہت فکرمند نہ ہوں۔ بلکہ فرائض زندگی کی بجا آوری میں کما حقہٗ کوشش کریں۔ یہاں تک کہ اگر اس سے ہمارے ذاتی و قدرتی جذبات کو بھی نقصان پہنچے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

مسیح کی اخلاقی تعلیم ان معانی میں یعنی ویرانہ تھی کیونکہ وہ محض ایک چھوٹے سے ملک کے محدود زمانہ کے لئے موزون تھی۔ ایک تغیر پذیر زمانہ کے لئے، ایک ایسی نسل کے لئے جو عنقریب قومی طور سے برباد ہونے کو تھی وہ ایک فانی زمانہ کے اخلاق سے متعلق تھی جس میں انسان کو انسانیت کی جانب ترقی کرنے کی ممانعت تھی۔ اس لئے وہ بعض کے نقطۂ خیال کے مطابق عاقبت اندیش اور وسیع نہ تھی کیونکہ وہ نہ تو مستقبل کا کچھ خیال کرتی ہے نہ اس عظیم الشان مہذب دنیا کا اور نہ انسانی طبیعت اور اُس کی گوناگوں بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کا کچھ فکر کرتی ہے۔ ہم کو ایک ایسے اخلاق کی ضرورت ہے جو ارتقائے انسانی کے لئے نہایت موزوں ہو۔ جو مختلف اقوام و ممالک اور اُن کی متعدد تہذیب کے مناسب حال ہو۔ ایک ایسے اخلاق کی جو خود انسان کی ذات کے لائق ہو اپنی طبعی و قدرتی قوائے کیستا

آپ ایسی نسل سے پیدا ہُوا ہے جو انسانیت سے بالاتر ہے اور جو اُس کے یعنی انسان کے فلسفہ۔ اُس کی حکمت اور اُس کے علوم و فنون اور اُس کے معاشرتی تصور کے موافق ہو۔

خداوند مسیح درحقیقت اپنی تعلیم کے ذریعہ سے ایسے ہی اخلاق کے اصول سکھاتا ہے لیکن اُس کے سمجھنے کے لئے عقل و فہم کی ضرورت ہے۔ اُس کے دیکھنے کے لئے ایک ہمدردانہ نظر درکار ہے۔ جس وقت کسی عطیہ کے حاصل کرنے میں عقل و ہمدردی کا استعمال کیا جاتا ہے اُس وقت اُس کی قیمت و قدر دو بالا ہو جاتی ہے۔ وہ عطا تو بے شک کی جاتی ہے لیکن اُس کو قبضہ میں لانے کے لئے رقت و دلسوزی کی ضرورت ہوتی ہے ہمیں خداوند مسیح کے قدموں میں بیٹھ کر تعلیم پاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی خداداد آزادی کو بھی کام میں لاتا ہے۔ وہ ہم سے فرمانبرداری کی توقع رکھتا ہے لیکن ہمیں آزادی کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

مسیح کی اخلاقی تعلیم ایک عظیم الشان حکمت ہے جو دیگر حکمتوں کی مانند ایک عام خیال ہے جس کو ایک خاص صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ غیر فانی ماہیت و حقیقت کا عدیم المثل اظہار ہے اور اُس کی صحت و فریفتگی کا راز یہی ہے۔ وہ لاثانی ہے لیکن اُس کے بغیر گذارا ممکن نہیں۔ اس کی سریع الزوال خصوصیت اُس کی غیر فانی عمومیت کو ظاہر کرتی ہے۔

آج کل کے زمانہ کے حالات عہد جدید کے زمانہ کے حالات کی نسبت وسیع معاشرتی اخلاق کے زیادہ قابل ہیں۔ چونکہ علم کے ذریعہ

انسان کی دولت پیدا کرنے کی قابلیت دوچند ہو گئی ہے اس لئے انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بڑھنے اور نشو و نما پانے کے لئے اب انسان کے جسم میں زیادہ زور و طاقت موجود ہے۔ سائنس نے نقل و حرکت کے وسائل کو آسان بنا کر تمام دنیا کے لوگوں کو باہم ملا دیا ہے۔ خاص کر ان پچھلے دنوں میں اخبارات۔ تار برقی و بے تار کی خبر رسانی کے ذریعہ سے اس طرح دنیا کی تمام اقوام ایک دوسرے پر اپنے خیالات کا اثر ڈال سکتی ہیں۔ رفاہ عام کے معاملات میں باہمی رفاقت و یگانگی قائم کر سکتی ہیں اور ایسے کاموں کو زیادہ فائدہ بخش بنا سکتی ہیں علاوہ بریں اس اثنا میں مسیحی مذہب کا خمیر تمام دنیا میں سرایت کرتا رہا ہے۔ خداوند یسوع مسیح کی شخصیت مقناطیس کا اثر دکھاتی رہی ہے جسکی کشش سے لوگ اُس کے مبارک قدموں میں کھچے چلے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ بُت پرستوں کے نزدیک بھی وہ ایک معنی میں راہ و حق و زندگی تصور کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ اُس کو مرد صالح اور رسول خدا تسلیم کر کے اُس کی عزت و تعظیم کرتے ہیں۔ اس طرح بنی نوع انسان ایک پُر زور عالمگیر جماعت کے شریک بننے اور اپنی تمام حرکات و کیفیات کے اخلاقی طور سے از سر نو تبدیل ہو جانے کے لئے تیار ہوتے رہے ہیں۔ اب اس کی ذمہ واری ہمارے کاندھوں پر ہے کہ ہم اپنے زمانہ کے لوگوں پر ابن آدم کی تعلیم کے تمام اشارات اور ایما کے معانی اور اُس کے تجسم کے راز کو لوگوں پر صاف اور صریح ظاہر کریں۔ اور پھر تمام انسانی معاملات میں ان کا مناسب و جائز استعمال کریں۔